محمد حنیف ندوی

نظریۂ توحید اور اقدارِ حیات

کیا نظریۂ توحید محض تجرید و انتزاع (Abstraction) کی کرشمہ سازی ہے یا یہ ایک مستقل بالذات عقیدہ ہے؟ اور اگر یہ مستقل بالذات عقیدہ ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ صرف عقیدہ ہی ہے یا اس کا تعلق اقدارِ حیات سے بھی ہے؟ اور اگر اس کا تعلق اقدار حیات سے ہے تو تیسرا سوال یہ ہے کہ رشتہ و تعلق کی یہ نوعیت آیا زندگی کے مثبت اور جامع پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور اس سے فی الواقع حیات انسانی کا کوئی دلآویز نقشہ ترتیب پاتا ہے۔ یا یہ صرف منفی قسم کے اندازِ فکر سے تعبیر ہے جس کو اپنا لینے سے یہ تو ممکن ہے کہ انسان کھلے ہوئے شرکیہ تقاضوں سے دامن کشاں رہ سکے۔ لیکن یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ اس کے ذریعہ زندگی کے استوار اور عادلانہ نظامِ حیات کی تخلیق کی جا سکے۔ آسان ترین پیرایۂ بیان میں یوں سمجھیے کہ عقیدۂ توحید کے بارہ میں دریافت طلب یہ نکتہ ہے کہ کیا یہ جامد اور ٹھس عقیدہ ہی ہے یا اس کو ایسی قدر (Ideal) ایسے فکر اور نصب العین کی حیثیت حاصل ہے جس کی روشنی میں فرد و معاشرہ کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات وضع کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ سوال جن کے جواب سے ہمیں اس صحبت میں نمٹنا ہے۔

جہاں تک توحید کے بارہ میں اس سوال کا تعلق ہے کہ اسے تجرید و انتزاع تسلیم کیا جائے یا مستقل بالذات عقیدہ مانا جائے، ہمارا موقف یہ ہے کہ اس مسئلہ کو طے کرنے سے پہلے اس سوال پر غور کرنا

ہوگا کہ خود دین کی حیثیت کیا ہے اور دین و تاریخ میں جو تعلق و نسبت ہے اس کا نہج کیا ہے ؟ کیا دین کے معنی انسانی فکر کے مخصوص ارتقا کے ہیں اور یہ ہیں کہ اس نے زندگی کے مختلف مرحلوں میں اپنے لیے کن عقاید کو اپنایا۔ کیا کیا معیار اور پیمانے مقرر کیے کس طرح کے رسم و رواج کی پابندیوں کو ضروری خیال کیا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس عالم آب و گل میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا وہ اس عالم آب و گل اور انسان کے بارہ میں غیر جانبدار اور غیر متعلق فرض نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے فیوض ربوبیت نے جس طرح اس عالم آب و گل کی رہنمائی کی ہے اور اس کو ارتقا کی تابش ضو سے بہرہ مند کیا ہے ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرہ کو آگے بڑھانے کی خاطر کچھ روشنیوں کا اہتمام بھی کیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ اس نے انبیا کو مبعوث فرمایا ہے۔ اقدار حیات کی تلقین کی ہے اور تاریخ کے ہر دور میں انسان کے لیے یہ بتایا ہے کہ کیا خیر ہے، کیا شر ہے، کن حقایق پر ایمان لانا ضروری ہے اور کن برائیوں سے مجتنب رہنا چاہیے۔

تاریخ و دین کے متعلق یہ دو الگ الگ نقطہ ہائے نظر ہیں۔ اگر نبوت کا اہتمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے اور خود اللہ تعالیٰ سے متعلق ہماری یہ رائے ہے کہ اسے دنیا کے اس کاروبار سے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تو پھر ہم تاریخ کے سلسلہ میں ایجابیت (POSITIVISM) کے حامی کومٹ (COMTE) کی اس تقسیم سہ گونہ کو صحیح قرار دے سکتے ہیں کہ انسانی ذہن نے اوّل اوّل یہ دیکھ کر کہ فطرت کے مظاہر انسانی زندگی کے حق میں مخالفانہ اسلوب اپنائے ہوئے ہیں۔ عناصر اور قوتوں کی حاکمیت تسلیم کی۔ اس کے بعد اصنام تراشے گئے اور مابعد الطبیعی عقاید میں تسکین قلب کے اسباب فراہم ہوئے۔ اور اب جبکہ مذہب و عقاید کی تخلیق کا یہ مرحلہ گذر چکا ہے اور انسان کے قلب و ذہن پر علم و معرفت کے نئے نئے آفتاب ابھر رہے ہیں۔ خالص سائنس کا دور دورہ ہے۔ اور ان حقایق کا سامنا ہے جن کا براہ راست تعلق تجربہ و مشاہدہ سے ہے مابعد الطبیعی مسائل سے نہیں!

یہ بھی ممکن ہے کہ وحی کے انکار کی صورت میں ہم تاریخ سے متعلق مارکس کے جدلی

(DIALECTICAL) تصور کو قبول کریں اور یہ کہنا شروع کردیں کہ عقیدہ و دین کا اپنا وجود ہی کہاں ہے ؟ اس نظامِ فکر کی جس کو آپ مذہب و دین کہتے ہیں حیثیت تو محض اس صدائے بازگشت کی ہے جس کو طبقات کی باہمی کش مکش جنم دیتی ہے اور پیدا کرتی ہے ۔

کومٹ کی تقسیم کو مانیں یا مارکس کے نظریۂ تاریخ کو، دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اصل مقام تاریخ اور اس کے ارتقاء کو حاصل ہے، اور مذہب و دین کی حیثیت ثانوی ہے ۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے مختلف ارتقائی مراحل میں مذہب و دین ایک مرحلہ سے تعبیر ہے یعنی مذہب و دین دراصل جواب ہے اس سوال کا کہ اس خاص دَور میں اقتصادی تقاضوں نے یا فکر و ذہن کے ارتقاء نے زندگی کی کس شکل کو اپنایا ۔ کیا پیمانے اور معیار وضع کیے اور کس نوع کی اخلاقیات کو ضروری سمجھا ۔

مارکس اور کومٹ کے نظریۂ تاریخ میں ہمارے نزدیک الگ الگ دو منطقی مغالطے کارفرما ہیں ۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی دانشوروں کے اندازِ استدلال میں بل یہ ہے کہ یہ حضرات دو ایسی حقیقتوں کے درمیان علّت و معلول کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جو مستقل طور پر علّت و معلول کے دو خانوں میں تقسیم پذیر نہیں ہیں ۔ جن کی ہر حقیقت بیک وقت علّت بھی ہے اور معلول بھی، سبب بھی اور مسبب بھی، چنانچہ ارتقاء کے کسی بھی مرحلہ میں اس امر کا فیصلہ دشوار ہے کہ کون کس درجہ علت و سبب ہے اور کس درجہ معلول و مسبب یعنی کیفیت انتاج (موڈ آف پروڈکشن) جس کو اشتراکی ہر ہر تہذیب کی اساس قرار دیتے ہیں ۔ مثلاً کوئی خودکار مشین نہیں بلکہ نتیجہ ہے تہذیبی اور فکری دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں ۔ ایک دوسرے کو بدلتے ہیں ۔ اور ایک دوسرے کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالتے ہیں ۔ غیر منطقی اسلوب بیان میں یوں کہنا چاہیئے کہ تاریخ مذہب و دین سے بالکل ہی الگ تھلگ اور غیر متعلق و غیر متاثر حقیقت کا نام نہیں ۔ اور نہ مذہب ہی کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس نے اپنے عصر و دَور کے اقتصادی اور اجتماعی عوامل کی تاثر پذیریوں سے بے نیاز رہ کر اپنا ہیولیٰ تیار کیا ہے ۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ سطح کا

دونوں نے مل جل کر اور ایک دوسرے سے اثر قبول کر کے زندگی کے حسین سانچوں کی تخلیق کی ہے اس لیے کہ دونوں کا تعلق زندگی سے ہے۔ تہذیبی حقایق سے اور فکر و نظر کی ان تبدیلیوں سے ہے جن کو ہر ہر دور میں انسان اپناتا اور ضروری ٹھہراتا ہے۔ کومٹ اور ان کے نظریہ تاریخ کو ماننے والوں کے طرزِ استدلال میں جو مغالطہ پایا جاتا ہے اس کو منطق کی زبان میں حد سے بڑھی ہوئی تبسیط (OVER SIMPLIFICATION) سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ آخر اس ترتیب کو مان لینے کے پیچھے کون استقراء (INDUCTION) مجبور کرتی ہے کہ انسان نے عقائد کا سفر عناصر پرستی سے شروع کیا۔ اور عناصر پرستی نے اسے بت پرستی تک پہنچا دیا۔ اور بت پرستی نے توحید کی راہ دکھائی۔ اس میں کیا منطقی اشکال ہے کہ ہمارا سفر توحید سے شروع ہو اور توحید کے بگاڑ سے بت پرستی جنم لے ہو سکتا ہے ایجابیت پسند اس کے ثبوت میں چند اثری شہادتیں پیش کریں۔

ہمارا جواب اس سلسلہ میں یہ ہوگا کہ بت پرستی پر دلالت کناں یہ اثری شہادتیں۔ اولاً استقرء کے اس درجہ تک پہنچ پائیں کہ جس پر کسی قطعی اور یقینی نتیجہ کی بنیاد رکھی جائے۔ ہو سکتا ہے آئندہ چل کر کوئی ایسی قدیم تر شہادت دستیاب ہو جائے جس سے ابتدائی معاشرہ کے خدوخال وضاحت سے ہمارے سامنے آسکیں۔ سرِدست توحید کے بارہ میں اس نوع کی اثری شہادت کے فقدان کی حیثیت عدم علم کی ہے لیکن عدم علم عدم واقعہ کا کب مقتضی ہے۔

ثانیاً توحید کے حق میں یہ عقلی دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ خود عناصر پرستی اور بت پرستی کے ضمن میں پہلے سے موجود ہے اور اسی بنا پر اس کو تجرید سے تعبیر کرنا ممکن بھی ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک وجود جو سرے سے موجود نہ ہو بطور تجرید و انتزاع کے اخذ کیا جا سکے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو ابن حزم نے اپنے ایک مضمون میں وجود باری کے ثبوت میں اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ اس عالم کی بوقلمونی اور تعدد بجائے خود یہ چاہتا ہے کہ یہاں کوئی کامل واحد بھی پایا جائے۔ گویا ہر ہر کثرت میں "وحدت کاملہ کا تصور پہلے سے داخل

ہے۔ ہمارے نزدیک کونی اور وجودی (POSITINIST) سطح پر جس طرح وجود باری پر دلالت کناں ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کی صفت توحید پر بھی دلالت کناں ہے اس بنا پر مسلمان متکلمین میں جن لوگوں نے توحید کو وجوب عقلی کے درجہ پر رکھا ہے انھوں نے جادۂ صحت وصواب سے انحراف نہیں کیا۔

تاریخ وعقیدہ کے بارہ میں اس مختصر وضاحت کے بعد اب ہمیں مثبت طور یہ بتانا ہے کہ ان کے مقابلہ میں توحید سے متعلق اسلام کا موقف کیا ہے؟

قرآن حکیم واضح الفاظ میں اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ توحید کا تعلق انبیاء علیہم السلام کے متفقہ شعور وحی سے ہے۔ اور یہ کہ وہ دین کی اس صورت میں ہمیشہ اتفاق رائے رہا ہے:۔

"وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الا نوحی الیہ انہ لا اِلٰہ الا انا فاعبدون" انبیاء ۲۵

اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

کذٰلك یوحی اِلیك والی الذین من قبلك اللہ العزیز الحکیم لہ ما فی السمٰوات وما فی الارض وھو العلی العظیم۔ شوریٰ ۴

خدائے دانا اسی طرح تمہاری طرف وحی بھیجتا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں کی طرف وحی بھیجتا رہا۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ اور وہ عالی مرتبہ اور گرامی قدر ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصّی بہ نوحًا والذی اوحینا الیك وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ" شوریٰ ۱۳

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی رستہ اختیار کیا جس کے اختیار کرنے کا نوح کو

حکم دیا تھا۔ اور جس کی تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا حکم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کو دیا تھا۔"

ابتدا میں جو انسانی معاشرہ معرض ظہور میں آیا اس میں توحید سے متعلق کوئی اختلاف رونما نہیں تھا۔

"وما کان الناس الا امۃ واحدۃ" (یونس ۱۹)

"اور سب لوگ پہلے ایک ہی ملّت پر تھے۔"

ابتدائی انسانی معاشرہ میں اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کا تصوّر کیوں اس درجہ مقبول تھا۔ اس کے کھلے ہوئے دو سبب ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ اللہ کے ہر پیغمبر اور فرستادہ نے بنی نوع انسان کو اسی حقیقت کی طرف دعوت دی۔

یاایھا الناس اعبدوا ربکم (بقرہ ۲۰)

"لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔"

ان اعبدوا اللہ ربی و ربکم (المائدہ ۱۱۹)

"اور یہ کہ تم خدا کی عبادت کرو۔ جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔"

دوسرے یہ کہ توحید کی دعوت کسی مذہبی تحکم (DOGMA) پر مبنی نہیں اور کسی منطقی موشگافی اور فلسفیانہ تکلف کی مرہون منت نہیں۔ بلکہ سیدھی سادی، دل سے اٹھنے والی اور دل پر اثرانداز ہونے والی آواز ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن اس کے لیے عموماً جو پیرایہ استدلال استعمال کرتا ہے وہ سادہ، دلنشین اور ہر طرح کے تصنع سے پاک ہے۔

ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القھار (یوسف ۳۹)

بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا و غالب۔

افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون (الواقعہ ۶۴)

بھلا دیکھو تو جو کچھ تم بوتے ہو؟ کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟

توحید سے متعلق قرآن کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور وحی والہام کی رہنمائی سے قطع نظر کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس پر گواہ، دلالت کناں اور شاہد ہے۔ اس لیے اگر انبیاء کی تشریف آوری نہ ہوتی جب بھی انسانی عقل وبصیرت کا یہی فیصلہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس کارخانہ حکمت و دانش کو چلانے اور پیدا کرنے والے پروردگار کا کھوج لگاتی۔

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ ۔ وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیٰت لقوم یعقلون۔ البقرہ ۱۶۴

بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں ۔ اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، اور کشتیوں اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں ۔ اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ لحاظ ہے کہ قرآن کائنات کے ہر ہر ظہور و تغیر کو "آیات" کے لفظ سے تعبیر ہے ۔ اس لیے کہ یہاں ہر ہر ظہور اور ہر ہر تغیر میں جو حکمت، جو نظام اور شفقت و رحمت کی فراوانیاں پنہاں ہیں وہ بجائے خود دلیل اور نشان ہیں۔

وفی کل شیٔ لہ اٰیۃ تدل علیٰ انہ واحد

ان سادہ مگر پُر اثر حقایق کے پہلو بہ پہلو اس خالص منطقی اسلوبِ بیان کی بھی داد دیجئے

لوکان فیہما اٰلہۃ الا اللہ لفسدتا۔ انبیاء ۲۲

"اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔"

اس دلیل میں کیا منطقی استواری پائی جاتی ہے۔ اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اللہ کے تصوّر وصفات پر غور کر لیا جائے۔

اگر اللہ کے معنی مطلق علم، مطلق قدرت اور مطلق ارادہ سے متصف ذات کے ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا اس میں تعدد فرض کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ اس میں صرف کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے بلکہ تعدد کی صورت میں کائنات کا وجود ہی خطرہ میں پڑ جانے کا امکان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض جدید حکماء اس بات کے قائل ہیں کہ ایسا فرض کر لینے میں کوئی عقلی قباحت پائی نہیں جاتی۔ کچھ حضرات اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ اس کائنات میں جو نقص وخلل اور شر پایا جاتا ہے۔ اس کی صحیح تر توجیہ توحید کو مان کر پیش ہی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے نقطۂ نظر سے زیادہ اغلب یہ ہے کہ اس ناقص و ناتمام عالم پر متعدد دیوتاؤں کا تسلط ہو۔ لیکن قرآن کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ہم یہ تو فرض کر سکتے ہیں کہ دو یا متعدد اللہ کا علم مطلق (ABSOLUTE) ہو اور قدرت مطلق بھی اطلاق لیے ہوئے ہو۔ یعنی ایسے دو تام العلم اور تام القدرت اشخاص فرض کر لینے میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ابھرتا، جو علم و قدرت میں یکساں مقدرت کے حامل ہوں مگر ارادہ میں یکسانی فرض نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ ارادہ کے بارے میں اشکال کی نوعیت یہ ہے کہ اگر ان میں ایک کا ارادہ مطلق اور غیر مشروط ہے تو دوسرے اور تیسرے کا ارادہ لامحالہ اسی نسبت سے آپ سے آپ مقید اور مشروط ہونا چاہیئے۔ یہ ناممکن ہے کہ دونوں ارادے غیر مشروط اور مطلق ہوں۔ علاوہ ازیں اس میں ایک بنیادی اشکال یہ بھی ہے کہ اگر متعدد اِلٰہ علم قدرت اور ارادہ میں یکساں مقدرت کے حامل فرض کیے جائیں تو ان میں تمیز کو کیونکر روا رکھا جائے گا۔ اور ان کو دو تین یا متعدد کس بنا پر کہہ سکیں گے۔

تعدد اسی صورت میں تو پیدا ہو گا جب ارادہ میں انفرادیت و امتیاز کی بدولت ان کے لیے تخلیق و آفرینش کے الگ الگ حلقے اور دائرے بنیں گے ورنہ کوئی شخص کبھی ان کو دو یا تین نہیں

کہہ سکے گا۔

اس مرحلہ پر ایک لگتا ہوا سا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں تعدد و شرک پیدا کیونکر ہوتا ہے۔ اور یہ اُمتِ واحدہ کب تفرق کا شکار ہوتی ہے۔ کہ جب کہ توحید دل کی آواز ہے سازِ فطرت کا پہلا اور آخری نغمہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے شعور و ادراک کا متفقہ فیصلہ ہے اور سب بڑھ کر یہ کہ عقل و خرد کا ادنیٰ اتقاضا ہے۔ اور اس کے خلاف قرآن ہی کے الفاظ میں اور کسی دلیل و برہان کا وجود ہی نہیں۔

"ما تعبدون من دونه الا اسماء سمیتموها انتم و اباءکم ما انزل الله بها من سلطان" یوسف ۴۰

"جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے۔ خدا نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔"

قرآن نے اس شبہ کا ایک ہی لفظ میں یہ جواب دیا ہے:۔

"بغیاً بینهم" بقرہ ۲۲۰

"آپس میں سرکشی کی وجہ سے"

یعنی شرک بھی اسی طرح کا ایک انحراف، اسی طرح کی ایک ذہنی و روحانی بیماری، اور عیب ہے جس طرح کے دوسرے عیوب ہیں۔ پھر جس طرح ازراہِ سرکشی انسان، ان عیوب کو بے دریغ اپنایا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس ظلمِ عظیم کے ارتکاب میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

شرک میں بغاوت اور سرکشی کا پہلو اس لیے زیادہ نمایاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توحید ایسے صاف ستھرے عقیدہ کو جب معرفت و نجات کا وسیلہ ٹھہرا دیا ہے جس کے سمجھ لینے میں کوئی پیچ کوئی اشکال اور دشواری باقی نہیں جاتی تو اس کے برعکس شرک و بُت پرستی کی پُرپیچ راہوں پر ہو لینا۔ آخر اس کے سوا کیا ہے کہ اس کے احکام کی کھلی ہوئی نافرمانی قرار دیا جائے۔

شرک میں تسکین کا نفسیاتی عنصر غالباً یہ ہے کہ بُت پرستی کی صورت میں ایک شخص نے اپنے

محبوب کو دیکھ لیتا، چھو لیتا، اور کبھی کبھی از راہ شوق چوم بھی لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی اس درجہ منزہ، بالا اور پاک ہے کہ اس تک ان ذرائع سے رسائی ممکن ہی نہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ سوال ایک محبوب کا نہیں ایسے محبوب کا ہے جو فکر و خیال کی حدبندیوں سے پرے ہے جس کا جمال جہاں آرا، انسانی حدبندیوں کا قائل نہیں۔ جسے بلاشبہ دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر اس جسمانی اور محدود آنکھ سے نہیں۔ ایمان و بصیرت کی نورانی اور غیر محدود آنکھ سے اس کو چھو لینا اور پالینا بھی ممکن ہے، مگر ہاتھوں سے نہیں۔ شوق کی فراوانیوں سے اور ذوق و وجدان کی سرمستیوں سے اور ایمان باللہ اور تعلق باللہ کے پُرکیف احوال سے ظاہر ہے کہ جو لطف غیر محدود اور ورا الوراء ذات گرامی کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے میں ہے۔ وہ محدود سے تعلق قائم کرنے میں نہیں۔ ان ضروری اور تمہیدی وضاحتوں کے بعد آئیے اصل موضوع کی طرف عنانِ فکر کو موڑیں۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ توحید صرف ایک عقیدہ ہی نہیں زندگی کا کامیاب لائحہ عمل بھی ہے اس کو اگر صحیح معنوں میں سمجھا جائے قرینے اور ڈھب سے منطقی تجزیہ کیا جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مختصر اور پیارے پیارے یہ دو بول لَآ اِلٰہ الا اللہ اپنے اندر اقدار معانی و معارف کا ایک جہان چھپائے ہوئے ہیں۔ کہنے کو یہ دو بول ہیں، ایک کلمہ ہے لیکن اس میں زندگی کا پورا نقشہ پنہاں ہے، علم و عمل کی ایک دنیا اور عظمتِ انسانی کا ایک عالم آباد ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی اہمیتوں کو صحیح معنوں میں محسوس کیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ اقرار و اعتراف اسلام کی ایک بندھی ٹکی صورت ہی نہیں اسلام کی مکمل ترین ترجمانی بھی ہے۔ یعنی اس کی حیثیت صرف اتنی ہی نہیں کہ یہ دروازہ ہے جس میں سے ہو کر ایک شخص اسلام کے دبستاں میں داخل ہوتا ہے بلکہ یہ اہل دل اور اصحاب معرفت کے نزدیک بجائے خود دلستاں ہے گل و گلزار ہے اور شمیم و نکہت ہے یہی وجہ ہے تمام انبیاء نے اس کی تبلیغ کی ہے۔ اور سیرت و کردار کی تعمیر کے سلسلے میں اسے بنیادی پتھر تصور کیا ہے۔ یہی نہیں اس کی مخالفت کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔

"اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" لقمان ۱۳

"شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے"۔
ایسا ظلم عظیم کہ جس کے بعد عفو و درگذر کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔
"انه من يشرك بالله فقد حرم الله عليه الجنة" (مائدہ ۷۲)
"جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا خدا اس پر بہشت حرام کر دے گا"۔

فکر و نظر کے اس موڑ پر قابل غور نکتہ یہ ہے کہ توحید اگر پوری زندگی کا مسئلہ نہیں ہے اور ان اقدار کا منبع و سرچشمہ نہیں ہے۔ جن سے بحیثیت مجموعی انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ اور اس سے مقصود صرف اتنا ہی ہے کہ لوگ بت پرستی سے دامن کشاں رہیں۔ غیر اللہ کے سامنے طلب و جستجو کا دامن نہ پھیلائیں۔ اس کے سوا نہ کسی کو پوجیں، نہ کسی سے مدد چاہیں اور نہ کسی کو پکاریں۔ تو اس صورت میں اس کی خلاف ورزی بلاشبہ ایک قسم کا گناہ ہے۔ ایک نوع کی بے وقوفی اور ناشکری ہے۔ لیکن اس کو یہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی کہ دین کی بنیاد اور اساس قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو بار بار انبیاء کو بھیجا۔ اور انبیاء نے بار بار توحید ہی کو پھیلایا اور پیش کیا۔ اس کے لیے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا۔ اور اس راہ کی جملہ مشکلات کو برداشت کیا تو یہ سب اس لیے نہیں تھا کہ لوگ ادنیٰ درجے کی شرکیہ عادات سے دست کش ہو جائیں اور بس۔ بلکہ اس لیے تھا لوگ اس کی روشنی میں اپنی پوری زندگی کو ڈھالیں اور بدلیں۔ ہمارے نزدیک توحید سے اگر کوئی پیغام اخذ نہیں کیا جا سکتا اس کو اپنا کر اگر زندگی میں انقلاب نہیں آتا، فکر و عمل کے دھارے نہیں بدلتے۔ اور فرد و معاشرہ کے لیے اس کی بدولت واضح طور پر منزل و راہ کی تعیین نہیں ہو پاتی تو پھر یہ محض عقیدہ ہے۔

آیئے! یہ دیکھیں کہ اس عقیدہ سے ایک فرد کو تابش وضوء کی کن کن کیفیتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہم اگر اس موضوع پر سرسری نظر ہی ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اس سے فکر و ذہن کو جِلا ملتی ہے۔ اور انھیں بصیرت حاصل

ہوتی ہے۔ قلب تصوّف وگداز سے اور توکل و ایقان کی نعمت سے مالا مال ہوتا ہے اور کردار اس کی بدولت حسن وجمال کے دلآویز سانچوں میں ڈھل کر رہتا ہے۔ گویا توحید ایک فرد میں جن اثرات اور تبدیلیوں کو پیدا کر دے سکتی ہے اس کو ہم تین موٹے موٹے عنوانوں میں محصور کر سکتے ہیں۔

عقل وبصیرت کا پہلو۔ تصوف کا پہلو، اور کردار و عمل کا پہلو۔ ذیل میں ہم تینوں عنوانوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے:۔

توحید عقل وبصیرت کے کن گوشوں کو اُجاگر کرتی ہے؟ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگانا چاہیئے کہ اس نے آج سے تیرہ سو سال پہلے کس حد تک قرنوں کے رچے بسے عربوں میں توہمات کو دُور کیا۔ کس حد تک ان میں سوچ سمجھ کے داعیوں کو اکسایا۔ اور کس حد تک عظمت آدم کے فلسفہ سے ان کو آگاہ کیا۔ کھلی ہوئی اصنام پرستی کے علاوہ اسلام سے پہلے عرب بیسیوں توہمات کے شکار تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان میں بعض کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً یہ نجوم وکواکب میں شعریٰ کو خدا سمجھتے تھے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ ستارہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کو تابانیاں تو خدا نے بخشی ہیں۔

"و انہٗ ھو رب الشعریٰ" (النجم ۴۹)

"اور وہی شعریٰ کا مالک و رب ہے"

فرشتوں سے متعلق ان کا کہنا تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن نے اس پر چبھتا ہوا اعتراض پیش کیا۔

"افاصفٰکم ربکم بالبنین واتخذ من الملئکۃ اناثاً انکم لتقولون قولاً عظیماً" (بنی اسرائیل ۴۰)

"کیا تمہارے پروردگار نے تم کو تو لڑکے دیے اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنایا۔ یہ تو بڑی (نا معقول) بات کہتے ہو۔

حیوانات میں بعض کو مقدس جانتے۔ اور دیوتاؤں کے لیے مخصوص ٹھہراتے۔ اسی طرح بعض کھیت ایسے ہوتے جن کے استعمال کو ممنوع سمجھتے اور یہ ملا کہتے۔

"ھٰذِہٖ اَنعَامٌ وَحَرثٌ حِجرٌ" انعام ۱۳۸

"یہ چار پائے اور کھیتی منع ہے"

انسانیت کی تذلیل اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ لوگ نہ صرف پتھر کے تراشیدہ بتوں کے آگے سجدہ کرتے تھے بلکہ اپنے زندہ بچوں کو بھی ان کے بھینٹ چڑھاتے اور اپنے ہاتھ سے ان کے گلوں پر چھری پھیرتے۔ قرآن نے خصوصیت سے قساوتِ قلبی کے اس مظاہرہ کا ذکر کیا ہے۔

"وَکَذٰلِکَ زَیَّنَ لِکَثِیرٍ مِّنَ المُشرِکِینَ قَتلَ اَولَادِھِم شُرَکَآؤُھُم لِیُردُوھُم" انعام ۱۳۷

"اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے ان کے بال بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے"

قرآن نے ان کے اوہام کے سلسلہ میں تطیر، یا بدشگونی کا بھی ذکر کیا ہے "اصحاب القریہ" کے ضمن میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کے پاس اوپر تلے تین تین رسول بھیجے تو انھوں نے تکذیب کا عمل برابر جاری رکھا اور کہا کہ ہم تمہارے وجود کو نامبارک اور منحوس خیال کرتے ہیں۔

"اِنَّا تَطَیَّرنَا بِکُم" یٰس ۱۸

"ہم تم کو منحوس و نامبارک سمجھتے ہیں"

شگون و بدشگونی کے علاوہ عربوں میں پانسوں سے فال لینے کا رواج بھی تھا جنھیں یہ اپنی اصطلاح میں ازلام سے تعبیر کرتے تھے۔ سورۂ مائدہ میں اس کا دو جگہ ذکر آیا ہے۔

"وَاَن تَستَقسِمُوا بِالاَزلَامِ ذٰلِکُم فِسقٌ"

"اور یہ بھی کہ تم پانسوں سے قسمت معلوم کرو۔ یہ سب گناہ کے کام ہیں"

"انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان" (مائدہ ۹)

"شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں"

غرض اسلام سے پہلے عربوں میں شرک کی وجہ سے متعدد طرح کے رنگ پائے جاتے تھے۔ توحید نے جو اُن میں جادو جگایا وہ یہ تھا کہ اوہام کے یہ تمام بادل چھٹ گئے۔ اور ذہنوں نے بندہ اور خدا کے مابین حائل ہونے والے تمام پردوں کو چاک کر کے رکھ دیا۔

(مسلسل)

حکمتِ رومی

از: خلیفہ عبدالحکیم

معنویت اور ادب و انشاء کی بلندی کے لحاظ سے اردو ادب کا زندہ جاوید کارنامہ۔

صفحات ۲۵۷، ۳/۵۰ روپے

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور